eISSN: 2791-0342
pISSN:2791-0334

سلیم الرحمٰن کی نظم میں عصری شعور

Contemporary consciousness in Salim-ur-Rahman's poem

جہاں گیر تاج
(ایم فل اسکالر، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور)

Jahangir Taj
MPhil Scholar,
Govt. College University, Lahore

Abstract:

Salim-ur-Rehman is counted in the list of the most reliable Urdu poets in terms of poetry. While a new style of expression can be seen in his poetry, on the other hand, a rich reflection of his era is also seen in his poetry. In his poems, from the massacres that took place after the establishment of Pakistan, to the hopelessness, despair, suffocation, emotional state and all the problems of urban life in the youth, he has made the subject of discussion with a very clever hand. As if his poem has a complete understanding of contemporary consciousness, which scribe has tried to explain in this article in a research and critical manner.

Key Words:

Salim-ur-Rahman, Modern Poem, Symbolism, Modernity, Contemporary Consciousness, Partition of India, Industrial Revolution

سلیم الرحمٰن کا شمار نئی شاعری کی تحریک کے بنیاد گزاروں میں ہوتا ہے، جنھوں نے نہ صرف اس نئی حسیت کو فروغ دیا، بل کہ اُس کے نظریاتی پہلوؤں کو بھی اُجاگر کیا۔ سلیم الرحمٰن نے نئے شعرا کی صف میں فکری و فنی دونوں سطح پر اپنی انفرادیت کو قائم رکھا۔ اُن کا مختصر سا شعری مجموعہ "شام کی دہلیز" ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ اس میں منظوم تمثیل "دریا" کے علاوہ چھوٹی بڑی انتالیس نظمیں شامل ہیں۔ نظموں کی بُنت شہری زندگی پر محیط ہے۔ اُس عہد کی اداسی اور مایوسی کی فضا پورے مجموعے پر اک خاص اضمحلالی کیفیت طاری کیے ہوئے ہے۔ شہری زندگی کے پس منظر میں اس عہد کی اداسی، مایوسی، معاشی و معاشرتی، تہذیبی اور ثقافتی جھلک ان نظموں سے مکمل طور پر عیاں ہوتی ہے۔ ازاں بعد چند نئی نظمیں "اجنبی سرد آسماں"

کے زیر عنوان ان کی کلیات "منظر جاگتا سوتا ہوا" میں شامل کی گئیں ہیں، جو جدید دور کے مغربی پس منظر میں لکھی گئی ہیں۔ ان نظموں کی خاص بات یہ ہے کہ ان میں جدید دور کے منظر کو بڑی آب و تاب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، جس سے سلیم الرحمٰن کے ہاں فکری و فنی بالیدگی کا مکمل ادراک ہوتا ہے۔ گویا انھوں نے موجودہ انسان کی اُلجھنوں اور مسائل کا جدید تھیوریز کے عین مطابق مرقع کھینچا ہے۔

اردو نظم کے آغاز سے ہی شعرا نے عصری شعور کے حامل مضمون باندھے ہیں۔ ہر عہد میں شعرا نے کسی نہ کسی حد تک عوامی مسائل پر بہ ہر حال خامہ فرسائی ضرور کی ہے۔ ابتدائی نظم نگاروں میں نظیر اکبر آبادی کا مقام اس لحاظ سے بھی بہت بلند ہے کہ اس کے ہاں سب سے زیادہ عوامی مسائل کی بازیافت ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ اسے پہلا عوامی شاعر کہا جاتا ہے۔ دیگر شعرا نے بھی بعد ازاں عوامی مسائل کو کسی نہ کسی حد تک اجاگر کیا ہے، لیکن اس عہد میں نظیر کی نظم کو ہی فی الواقع عصری حسیت سے بھرپور کہا جاسکتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی وہ اہم موڑ ہے، جس نے ہندوستان کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ جہاں عوام الناس کی زندگیاں یکسر بدل کر رہ گئیں، وہیں شعرا کی سوچ کے بھی دھارے تبدیل ہو کر رہ گئے۔ جنگ آزادی کے بعد جہاں غزل کے بہ جائے نظم کی طرف توجہ تیز ہوئی، وہیں اس میں انسانی جذبات و احساسات کو بھی بھرپور جگہ دی گئی۔ اردو نظم کو مقام دلانے میں انجمنِ پنجاب کی خدمات کو کسی صورت فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ انجمن پنجاب کے توسل سے ہی نظموں کی طرف توجہ تیز تر ہوئی اور نظم نے اپنے عہد کی صحیح معنوں میں نمائندگی کی طرف قدم بڑھایا۔ ازاں بعد کم و بیش تمام شعرا نے اس عہد کے خارجی حالات کے ساتھ ساتھ داخلی بحرانوں کا بھی خوب مرقع کھینچا ہے۔ انیسویں صدی کے ربع اول تک نظم نگاروں نے اس دور کی معاشی و معاشرتی، تہذیبی و ثقافتی، سیاسی و سماجی اور کئی ایک نفسیاتی مسائل کو انتہائی چابک دستی سے بیان کیا۔ ربع اول و دوم میں نظم میں جہاں کئی ایک ہیئتی تجربات ہوئے، وہیں علامہ اقبال (۱۸۷۷۔۱۹۳۸) نے نظم کو وہ وقار بخشا کہ اسے دنیا کے کسی بھی بڑے ادب کے سامنے لا کھڑا کیا۔ ربع دوم میں اردو نظم کو نوجوان شعرا تصدق حسین خالد، میرا جی، ن۔م۔راشد، قیوم نظر، مختار صدیقی، مجید امجد، اختر الایمان، فیض احمد فیض اور اسرار الحق مجاز نے نہ صرف فکری و فنی سطح پر سنوارا بل کہ سیاسی و سماجی اور معاشی و معاشرتی طور پر اس عہد کا عکاس بنایا۔ گویا اس عہد کے خارجی مسائل تو موضوع بحث بنے ہی ساتھ ہی داخلی الجھنوں کا بھی ادراک کیا گیا۔

قیام پاکستان کے بعد شعرا کی ایک ایسی نسل سامنے آتی ہے، جس نے اس دور کی بے چینی، ہیجانی کیفیت اور داخلی بحرانوں کو نظم میں ڈھالا۔ اس نسل نے سیاسی و سماجی، معاشی و معاشرتی اور تہذیبی و ثقافتی اقدار کی توڑ پھوڑ کو دیکھا، تو خارجی و داخلی بحرانوں کی دلدل میں دھنستے چلے گیے۔ نئے نظم نگاروں نے اس عہد کی شکست و ریخت کو اپنے ہاں بھرپور جگہ دی اور نئی حسیت کی حامل شاعری کو فروغ دیا۔ یہ رجحان روز بہ روز بڑھتا گیا اور ۱۹۵۵ء کے لگ بھگ ایک تحریک کی صورت اختیار کر گیا۔ اس دور کی مکمل عکاسی ان نئے شعرا کے ہاں ہوتی ہے۔ نئے شعرا جس کرب سے گزرے، اُسے پروفیسر حامدی کاشمیری احاطۂ تحریر میں لاتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> "تقسیم ہند کا دور انتشار، تخریب، ہراس خوف، مایوسی اور تباہی کا دور تھا، اس پر آشوب دور نے اُردو ادیبوں اور شاعروں کے احساس و فکر پر گہرے اور دور رس اثرات مرتسم کیے۔ ملک بھر میں سیاسی حالات اور معاشی مشکلات نے انہیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کیا، وہ مایوسی اور نا اُمیدی کے اندھیروں میں ڈوب گیے۔ انھیں

آزادی کا سورج اندھیروں کی گھٹاؤں میں چھپا ہوا نظر آیا چناں چہ مایوسی اور آرزوؤں کی شکست کا یہ رجحان اس دور کی نظموں پر غالب نظر آتا ہے۔"(۱)

پروفیسر حامدی کاشمیری نے اگرچہ ہندوستانی صورتِ حال بیان کی ہے، لیکن پاکستان میں اس کے علاوہ مارشل لا نے مزید گھٹن، مایوسی اور پابندیوں میں اضافہ کیا۔ اس دور میں ہر طرف بے چینی، ہیجانی کیفیت، مایوسی، اداسی اور نفسیاتی اُلجھنیں بڑھ رہی تھیں۔ لوگ نئے ملک کی آزادی سے بہت سی اُمیدیں وابستہ کیے ہوئے تھے، جب کہ حالات و واقعات یکسر مختلف منظر نامہ پیش کر رہے تھے۔ ان عذابوں کے علاوہ ہجرت کے بہ موجب بے سروسامانی اور لاچارگی کی حالت نے جہاں انسان کو مایوسی کی دلدل میں دھکیلا، وہیں اُسے اس ماحول کا مقابلہ کرنے پر بھی اُکسایا۔ اس عہد کے نوجوانوں نے حالات کی سنگینی اور گھٹن کو زیادہ محسوس کیا۔ اس حبس بے جا کے عالم میں نوجوانوں نے آزادی اظہار کی پابندیوں کا بھی سامنا کیا۔ بہت سے شعرا و ادبا نے کئی صعوبتیں برداشت کیں۔ آزادی اظہار پر قدغن حکومتِ وقت اور بعد ازاں آمرانہ دور کا خاص وطیرہ رہا۔ ظاہر ہے ان ظالمانہ اطوار سے وہ اپنی مطلق العنانی کو مستحکم کرنے کے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے، یہی سبب ہے کہ ہر طرح کی آزادئ اظہار رائے ان کے لیے زہرِ قاتل تھا۔

اسی عہد میں شعرا نے ایک خاص علامتی، تجریدی اور تمثالی اُسلوب اپنایا۔ جہاں انفرادی سطح پر مختلف شعرا اور ادبا نے کوشش کی، وہیں اجتماعی سطح پر کچھ رجحان اور تحریکیں منظرِ عام پر آئیں۔ نئی شاعری اور لسانی تشکیلات کی تحریک اس سلسلے میں بہت اہم ہے، کیوں کہ اس تحریک نے نہ صرف کئی لسانی تجربات کیے، بل کہ علامتی اور تجریدی پہلو بھی اُجاگر کیے۔ اس تحریک کے گرو افتخار جالب کو تسلیم کیا جاتا ہے، جنھوں نے نظریاتی بنیادوں پر اس تحریک کو نہ صرف وضع کیا، بل کہ شاعری میں عملی مظاہرہ کیا۔ دیگر اہم شعرا میں ڈاکٹر انیس ناگی، زاہد ڈار، عباس اطہر، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، عبدالرشید، جیلانی کامران، اختر احسن، گوہر نوشاہی، آفتاب اقبال شمیم، اعجاز فاروقی، ڈاکٹر سعادت سعید اور سلیم الرحمٰن شامل ہیں۔ بالخصوص سلیم الرحمٰن اپنی شاعری میں نئی حسیت سے متعلق ایک انٹرویو میں بیان کرتے ہیں:

"اس وقت جو حالات تھے کہ ایک نئی قسم کی sensibility اور senstivity پروان چڑھ رہی تھی۔ اس میں ہم سب جکڑے ہوئے تھے۔ اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ پرانی ڈکشن اور شعری لغت جو ہے، وہ شاید مناسب اظہار کا اُسلوب نہیں ہے۔ شاید نئے لفظوں کی ضرورت ہے۔ اس ساری research اور تلاش میں ایک نئی تحریک یا ایک نئے رجحان کا آغاز ہوا۔ جس میں افتخار جالب تھے جو کہ کافی لوگوں کے گرو بھی مانے جاتے ہیں، انیس ناگی صاحب تھے، میں خود تھا اور اس کے علاوہ زاہد ڈار، جیلانی کامران اور کئی اور لوگ شامل تھے۔ ان لوگوں کی وساطت سے نئی شاعری کا آغاز ہوا اور اس ۶۰ء کی دہائی کا اثر آج تک اُردو شاعری پر موجود ہے اور اس سے انحراف نہیں کیا جاسکتا۔"(۲)

سلیم الرحمٰن کی ابتدائی دو نظمیں "سوالوں کی زنجیر" اور "ایک کتبہ" بہت اہم ہیں۔ ان دو نظموں میں سلیم الرحمٰن کا فن فکری سطحوں پر بہت بلند ہو گیا ہے۔ وہ ایسے سوالات اُٹھاتے ہیں، جو ۱۹۴۷ء کے سانحے کے بعد ہر نوجوان کے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔ تقسیم کا سانحہ ہر ذی شعور

ذہن میں کئی سوالات نقش کر گیا۔ ہجرت کا کرب، قتل وغارت، عصمتوں کی پائمالی اور انسانیت کا قتل، اتنی آسانی سے ہضم نہیں ہو سکتا تھا۔ گھر بار چھوڑ نا اور ہم جولیوں سے یک لخت جدا ہونا اتنا آسان نہ تھا۔ سلیم الرحمٰن نے ان واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ بہت سے دوست ہجرت کر گیے اور کچھ لقمۂ اجل بن گیے۔ اس خون ریزی کا دل سوز نظارہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ "ایک کتبہ" کے ابتدائی چار مصرعوں سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ شاعر اس خونی کھیل کا حصہ اُس وقت بنتا ہے، جب ہر طرف سے زمیں لہو سے لال ہو چکی تھی۔

یہ میرا المیہ ہے
میں اُس وقت اس کھیل میں آ کے شامل ہوا
جب ہر اک شکل
اپنے لہو کی مچلتی ہوئی آگ سے سُرخ تھی۔۔۔۔۔(۳)

ان مصرعوں سے ۱۹۴۷ء کے خون آشام واقعات صاف عیاں ہیں، سلیم الرحمٰن کا تعلق اُس نسل سے ہے، جس کے سامنے تقسیم کے واقعات رونما ہوئے، لیکن یہ نسل اس کھیل میں خاموش تماشائی بنی دیکھتی رہی۔ تقسیم کے وقت صدیوں پرانی مذہبی منافرت بھی کھل کر سامنے آتی ہے۔ اگرچہ مسلمان اور ہندو صدیوں ایک ساتھ اکٹھے رہے، لیکن کہیں نہ کہیں نفرتوں کا بیج بویا جاتا رہا۔ ظلم و استبداد اور بربریت کے واقعات صدیوں سامنے آتے رہے، لیکن اس قدر کھل کر نہیں ہوئے، جیسے ۱۹۴۷ء میں ہوئے۔ ۱۹۴۷ء کی علاحدگی مذہبی بنیادوں پر ہوئی اور قتل وغارت کے محرکات میں مذہب بھی شامل تھا۔ یوں صدیوں کی سوئی ہوئی نفرتیں ایک دم سے جاگ اُٹھیں اور انسانیت سسک سسک کر دم توڑتی رہی، گویا دنیا جہنم کا منظر لگ رہی تھی۔ ذیل کے مصرعے دیکھیے:

آج صدیوں کی سوئی ہوئی نفرتیں جاگ اُٹھی ہیں
آنکھیں وہ دوزخ ہیں جن میں
ہر اک شعلہ اک دوسرے سے جُدا
رنگ میں آگ میں نقش میں جاگتا ہے
مجھے پہلے دن سے یہاں
اپنے ہاتھوں سے اپنی رگیں کاٹ کر
خوں بہانے کی لذت ملی ہے۔(۴)

جیلانی کامران "ایک کتبہ" کے ضمن میں رقم طراز ہیں:

"تقسیم برِ عظیم" شام کی دہلیز" کی طرف ایک قدم ہے۔ یعنی اُنیس سو سینتالیس کے اس طرف مسلمانوں نے تہذیبی طور پر جتنا سفر کیا ہے وہ شام کے دھندلکے سے رات کی سیاہی کی جانب سفر ہے۔ یہ مفروضہ صرف اس حد تک قابل غور ہے کہ شاعر کسی ایک تاریخی نقطے سے الگ ہوتے ہوئے تہذیبی عمل کو سفر

بجانب شب کہتا ہے۔ کھلے لفظوں میں پاکستان میں مسلمانوں کی تہذیبی شخصیت کا اظہار ایک ایسا عمل ہے جسے شاعر میرؔ آجی کے زمانے کی شخصیت سے الگ ہوتے ہوئے دیکھ کر رات کی تاریکیوں کی خبر دیتا ہے۔ یہ آواز کوئی نئی آواز نہیں ہے۔ اس کی جڑیں "مہابھارت" کے جذباتی تصور میں بری طرح پیوست ہیں وہ شاعر جب اپنی شخصیت کو اس تصور کی روشنی میں دیکھتا ہے اُسے ہر طرف رات دکھائی دیتی ہے اور وہ شام کی دہلیز کا کتبہ لکھنے لگتا ہے۔"(۵)

جیلانی کامران کی بات سے جُزوی طور پر اختلاف کیا جاسکتا ہے، کیوں کہ تقسیم سے واقعتاً لاکھوں انسانوں کی جاں کا ضیاع ہوا، لوگوں کے جان ومال کے علاوہ ان کی عزتیں بھی محفوظ نہ رہ سکیں۔ ہندوستان میں اس سے پہلے مذہبی پیروکاروں نے انسانیت کو کبھی اتنا نقصان نہیں پہنچایا۔ اس کرب ناک اور وحشت ناک سانحے نے بستیوں کو کھنڈرات میں بدل دیا اور ہنستے بستے گھر خاکستر کر دیے۔ یہی سبب ہے کہ سلیم الرحمٰن بہ بانگ دُہل پکار اُٹھتے ہیں:

میں اُن میں نہیں ہوں، جو ہوں گے
میں اپنے سوالوں کی زنجیر میں قید ہوں
میرے لیے معجزے اور پرانی کتابوں میں لکھی ہوئی ساری سچائیاں
مردہ نسلوں کی تاریک قبروں پہ مٹتی ہوئی تختیاں ہیں
مجھے اپنے اجداد کی ہڈیوں میں کبھی زندہ ہونے کی خواہش نہیں ہے
مجھے اتنا معلوم ہے
میرے اور موت کے درمیان سانس کا ایک لمحہ ہے
اور عمر کا ایک جھونکا
مرے واسطے زندہ رہنے کا کوئی بہانہ نہیں ہے!(۶)

سلیم الرحمٰن کے ہاں ایک خاص اُداسی اور لاچاری کا عالم ہے۔ اس میں انسان مسلسل گھرتا چلا جاتا ہے۔ ہر طرف بلند وبالا دیواریں ہیں، جو انسان کو مقید کیے ہوئے ہیں۔ انسانی محکومی، ناطاقتی اور کرب ناکی کا مظاہرہ اُن کی نظم "دل اور آنکھیں" میں کیا جاسکتا ہے۔ اس نظم کے آغاز میں شاعر بہت سی آرزوؤں کا اظہار کرتا ہے۔ اُس کا دل چاہتا ہے، وہ فضاؤں میں اُڑے اور زندگی کی تمام تر خوشیوں کو حاصل کرے۔ دل کا دروازہ کھول کر ہوا ملن کے مست لمحوں کو چُرا کر لاتی ہے اور ہر طرف خوشبوئیں پھیل جاتی ہیں اور وہ چاندنی رات میں شانوں پر لہراتے ہوئے آنچل کے خیال میں مسحور ہو جاتا ہے اور کبھی مست شاخوں جیسی بانہوں میں اُلجھتا ہے، یہاں شاعر نے ایک رومانوی فضا قائم کی ہے جس سے اُس کا دل جھومتا تو ہے لیکن یہ طلسماتی دنیا ٹوٹتے دیر نہیں لگتی اور سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ شاعر دلی خواہشات کی تکمیل میں آنکھوں کو بے نور کر دیتا ہے، گویا کہ اک عجیب سی اُداسی چھائی ہے۔ نظم کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

یہ آوازیں،
اگر تھک کے بھی سو جائیں
تو ان کی گونج کی ہلکی سی لرزش بھی
مرے کانوں کو ڈستی ہے
مری آنکھیں اگر بے نور ہو جائیں
تو ایسی روشنی کی تیز کرنوں سے
ہر اک تصویر میرے ذہن میں اپنے چمکتے روپ میں ہنستی ہے، بستی ہے
یہاں غاروں کی تاریکی سی چھا جائے
ہوا کا ایک جھونکا بھی نہ آئے،
مگر اب یہ رُلانے والا دروازہ ہمیشہ کے لیے
میں بند کر دوں گا
مری آنکھوں سے گھل مل کے یہ نیر
آ کر بہیں کب تک؟
یہ دروازہ کھلا آخر رہے کب تک؟(۷)

شہری زندگی میں ایک طرف انسان ترقی کی منازل طے کر رہا ہے، تو دوسری طرف اُس میں احساس ختم ہو رہا ہے۔ نامیاتی معاشرے کی توڑ پھوڑ سے انسان کی ذات شکست وریخت کا شکار ہے۔ اس سلسلے میں عارفہ بتول رقم طراز ہیں:

> "جوں جوں شہری زندگی ترقی پا رہی ہے توں توں ایک انسان کا دوسرے انسان سے تعلق واسطہ تنزلی کا شکار ہے، بل کہ یہ کہنا بے جا نہیں کہ اس تعلق واسطے میں نا قابل تعمیر دراڑیں پڑتی جا رہی ہیں، جن سے ماحول ہی نہیں خود انسان بھی کھوکھلا ہو رہا ہے۔ چناں چہ سلیم الرحمٰن کے ہاں انسان جدید تمدنی زندگی سے بے زار ہو کر ماورائی دنیا تخلیق کرتا ہے اور اسی لمحہ ورا میں رہنے کو عافیت سمجھتا ہے۔ اگرچہ فرد بہ خوبی علم رکھتا ہے کہ اس طرز کی زیست لایعنی اور بے مقصد ہے مگر اپنے ماحول کو شکست دینے کا اور کوئی حل اس کے ذہن میں موجود نہیں۔"(۸)

اُن کی نظم "شہر اور زنجیر" معاشرتی کرب کی تمثال ہے۔ شہری زندگی نے انسان کو پابہ گِل کر دیا ہے۔ اُس کے پاؤں میں زنجیر ہے، جس نے اُسے جکڑا ہوا ہے۔ اُس کی نت نئی اُلجھنیں اُس کے لیے وبالِ جان بنی ہوئی ہیں۔ سارا دن انسان ویران گلیوں میں ننگے پاؤں کنکروں پر چلتا ہے۔ اُس کے پاؤں چھلنی ہو جاتے ہیں۔ اُس پر طرفہ پاؤں زنجیر سے بندھے ہوئے ہیں۔ یہاں زنجیر ایک ایسی علامت کے طور پر اُبھرتی ہے، جس نے ہر شہری کو قید

کیا ہوا ہے۔ موجودہ انسان صارفی معیشت اور معاشرتی ناہمواریوں میں اس قدر اُلجھ گیا ہے کہ بہ ظاہر اُس کو لگتا ہے، وہ آزاد ہے لیکن حقیقت اس سے یکسر مختلف ہے۔ گویا وہ اسی محکومی اور بے بسی کے عالم میں زندگی کرنے کی تگ و دو کر رہا ہے۔

کھلی بارکوں میں
درختوں کے چمکیلے پتوں پر گرتی ہوئی روشنی میں
کبھی چاند کے نیلگوں سائے میں بیٹھ کر
درد کے تیز کانٹے نکالوں گا، چپ چاپ!
بجھتی ہوئی رات کے آخری پہر میں
سُونے بستر کی ڈستی ہوئی ناگنوں پر
میں بھوکے بدن کو رُلاتا رہوں گا(۹)

یہاں کھلی بارکیں، درد کے تیز کانٹے، سُونے بستر پر ڈستی ہوئی ناگنیں اور بھوکے بدن کو رُلانے جیسی تمثالیں جہاں انسانی بے بسی کا اظہار کر رہی ہیں، وہیں اُس کی کرب ناکی کا بھی مظہر ہیں۔

شام کی دہلیز میں شامل دو نظمیں "بیمار لڑکی" اور "ہسپتال" سلیم الرحمٰن نے اس زمانے میں تحریر کیں، جب وہ خود میڈیکل کے طالب علم تھے۔ ان دونوں نظموں میں انھوں نے علامتی اور تمثالی پہلو اختیار کیا ہے۔ "بیمار لڑکی" ایک ایسے معاشرے کی علامت کے طور پر سامنے آتی ہے، جس کا فرد ایسے مرض میں مبتلا ہو چکا ہے، جس کا علاج ممکن نہیں ہے۔ وہ مریض جانتا ہے کہ اُس کی زندگی کا فیصلہ ہو چکا ہے، لیکن وہ زندگی کرنے کی آس نہیں چھوڑ رہا۔ وہ فرد اگرچہ اپنے مسیحاؤں سے اُکتا چکا ہے، لیکن ہمت اور آس نہیں توڑ رہا۔ یہاں مسیحا وہ افراد ہیں جو معاشرے کے درد کا درماں ہونے کا واشگاف اعلان کرتے ہیں۔ غور طلب بات ہے کہ وہ بیمار فرد ان مسیحاؤں کے نام نہاد نعروں سے واقف ہے اسی لیے آزاد فضاؤں کی طرف رجوع کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں پروفیسر محمد حسین کی رائے بہت وقیع ہے۔:

> "حُسن اور حسن بیمار، دوشیزگی اور وہ بھی جینے کی شدید خواہش کے ساتھ اور اس کے ساتھ بیماری وہ جو لاعلاج ہے۔ گویا یہ ایک طرح کا عالم آشوب ہے کہ ہماری دنیا بھی اپنی تمام دلفریبی اور دلکشی کے باوجود اس قسم کے کرب میں مبتلا ہے، عالم نزع میں ہے اسے جینے کی خواہش بھی ہے اور اس خواہش کے پورے ہونے کا امکان بھی بہت کم ہے۔ وہ اپنے نام نہاد معالجوں سے تنگ آ کر ہواؤں کی آزاد روی سے مسیحائی چاہتی ہے۔ شام کا لفظ واضح اشارہ ہے۔"(۱۰)

آج کا فرد جس قدر ہجوم میں تنہا ہو گیا ہے، اس کا واضح عکس اس نظم میں جھلکتا ہے اُسے اپنے دُکھ تنہا سہنے پڑ رہے ہیں۔ مزید بر آں جینے کی اُمنگ تو ہے، لیکن اُسے اپنے انجام کا بھی ادارک ہے، یہی سبب ہے کہ وہ مایوس اور ناتواں ہو چکا ہے اور اس عالم تنہائی اور لاچاری میں پکارتا ہے:

اونچے اونچے درختوں کی غم ناک سی چھانو ہے!

میرے سرہانے کا ننھا مُنا در یچہ کئی بار کھلتا رہا
جگمگاتی ہوئی روشنی آئی، موسم بدلتا رہا
چاندنی رات میں پھول کھلتے مگر میں نے دیکھے نہیں
دل میں سہمی خواہشوں کے
کبھی ہونٹ ہلتے مگر میں نے دیکھے نہیں
میں نے جب ڈرتے ڈرتے کبھی آنکھ کھولی
مرے چاروں جانب دُھند لکا سا تھا!
میں نے چپکے سے جب بھی سانس لی
میری رگ میں سمٹا ہوا میرا دُکھ کم نہیں ہو سکتا
میں نے نیلے خلاؤں میں اُڑتے ہوئے پنچھیوں کو صدا دی
مگر میرا کوئی نہیں تھا!
آج بھی میرا کوئی نہیں(۱۱)

نظم کے آخری دو مصرعے معاشرے میں فرد کی کرب ناکی کا اظہار بڑے موثر انداز میں کر رہے ہیں۔ اسی طرح نظم "ہسپتال" کو اُس معاشرے کا مکمل عکس سمجھنا چاہیے، نظم میں چھوٹی چھوٹی تمثالیں اور علامتیں مل کر ایک بہت بڑی علامت بن جاتی ہیں۔ ہسپتال دُکھی انسان کے لیے جہاں ہر درد کا درماں ہے، وہیں دُکھوں، تکلیفوں اور مرضوں کی آماج گاہ بھی ہے۔ ہر طرف خزاں کا منظر نامہ پیش ہو رہا ہوتا ہے اور سارے پھول گردنیں جھکائے سوکھ رہے ہیں۔ یہاں زرد پھولوں کی سوکھی اور جھکی ہوئی گردنیں، اُن مریضوں کی ہیں جو مختلف بیماریوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ دھڑکنیں لرزاں ہیں اور ہر آنکھ مایوسی میں ڈوبی ہوئی ہے اور سلگتے جسموں میں بے چین ہڈیوں کا چٹخنا لاچار اور لاغر افراد کی تمثالیں ہیں۔ نظم کا یہ اقتباس دیکھیے:

خزاں کی ویران رہگزاروں پہ
خشک پتوں کی کھڑ کھڑاہٹ
ہزار دُکھ کی کتھا کہانی سنا رہی ہے
کہاں تلک کوئی
زرد پھولون کی سُوکھتی ان جھکی ہوئی گردنوں کو
چُپ چاپ دیکھ کر سوچتا رہے
اور مہیب بے سلسلہ خیالوں کے تانے بانے سے بُنتا جائے
کبھی کواڑوں کو ہولے سے کھٹکھٹاتی

ہوا کی دستک کو سنتا جائے
سسکتی اور ڈولتی ہوئی دھڑکنوں کو
گنتا رہے کہاں تک؟
ہر ایک مایوس آنکھ اب منتظر ہے
ہمدرد، رحم دل، مہربان شب کی
کہ اُجلے اُجلے پروں کو پھیلائے نیند آئے
چٹختی بے چین ہڈیوں میں
سُلگتے جسموں میں!
آجگائے شکوں کا جادو، (۱۲)

نظم میں گو کہ ایک اسپتال کا منظر نامہ بیان کیا ہے، لیکن پس پردہ پورے معاشرے میں موجود انسان کی بیماری، دُکھ، ذہنی و نفسیاتی اُلجھنوں کا بھرپور مرقع کھینچا گیا ہے۔ ایک اُداس اور مایوس فضا پوری نظم میں موجود ہے۔ معاشرے میں مایوسی کے اگرچہ محرکات بیان نہیں کیے، لیکن اُس درد اور غم کی کرب ناکی صاف عیاں ہے۔ نظم کے اختتام میں شاعر اس بیمار معاشرے کو اُمید دلاتا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ سب گھاؤ بھر جائیں گے اور پھر سے بہاریں لوٹ آئیں گی۔

کہ رُت پھرے گی، نئی نویلی ہوا چلے گی
ہری بھری مست آستینیں ہوا میں
پھر پھڑ پھڑائیں گی، گنگنائیں گی
زرد خشک سی ٹہنیاں ہنسیں گی
یہ بستیاں رنگ روپ میں
پھر رسیں گی (۱۳)

انسان نے دورِ جدید میں ترقی کے کئی مدارج طے کیے ہیں۔ آج انسان سائنسی اور صنعتی انقلاب برپا کر رہا ہے۔ ٹیکنالوجی نے انسانی زندگی کو ہر طرح کی آسائش پہنچائی ہے۔ دورِ حاضر کی مثالی ترقی جہاں انسان کو اوجِ کمال عطار کر رہی ہے، وہیں ہوس و لالچ بڑھنے کے سبب فطرت کو بھی نقصان پہنچ رہا ہے۔ دُھواں اُگلتی چمنیوں نے جہاں فضائی آلودگی میں اضافہ کیا ہے، وہیں زمیں کی شوریدگی کم کرنے کے لیے کھاد اور کیمیکلز کے استعمال سے پیداوار تو بڑھی ہے لیکن فصلیں زہر آلود ہو گئی ہیں۔ ازاں بعد آبِ حیات بھی کس مپرسی میں ہے۔ مزید برآں صنعتی دور میں مزدوروں کا استحصال بھی بہت زیادہ ہو رہا ہے۔ اُن کی حفاظت کے لیے بھی کچھ خاص اقدامات نہیں ہو رہے۔ گویا معاشی طور پر اُن کا بے دردی سے استحصال ہو رہا ہے۔ سلیم الرحمٰن کی نظم "آنکھیں" اس سارے منظر نامے کو بیان کرتی ہے۔ "آنکھیں" ایسے فرد کی علامت کے طور پر سامنے آتی ہیں جو سب کچھ بے بسی سے

دیکھ کر اندر ہی اندر کُڑھتا ہے اور سارا دن شہروں میں ماحولیاتی اور معاشی استحصال دیکھنے کے بعد ان آنکھوں کو نیند کے سُکھ سے آشنا کرنا چاہتا ہے۔ سیاہ رات میں کسی نرم و نازک بدن کو دھیان کے محل میں سجا کر روح تک کو تسکین پہنچانا چاہتا ہے۔ در حقیقت شہری زندگی میں معاشی و معاشرتی استحصال کی بہ دولت اَن گنت ادھوری خواہشات لیے انسان خود کو نیند کے سپرد کر دیتا ہے۔

سارا دن شہر کی نیلی نیلی رگوں میں
دھڑکتی ہوئی زندگی کا سماں
پیلے پیلے مکانوں کی رنگت، سیہ چمنیوں کا دُھواں
دیکھتے دیکھتے،
درد نس نس میں گھُلنے لگا ہے
سارا دن کالے حرفوں کی بے جان لمبی قطاروں کے پیچھے
بھٹکتے ہوئے
من سے اُجلی سی ہر بات اُتری ہے(۱۴)

اُردو شعر و ادب میں موت کے موضوعات بہ بطور خاص فن پاروں کا حصہ رہے ہیں۔ سلیم الرحمٰن نے بھی اس موضوع پر طبع آزمائی کی ہے، لیکن اس ضمن میں اُن کے ہاں خواہش مرگ کے ساتھ تنہائی کا بھی عالم پایا جاتا ہے۔ جو عہد جدید کی بہت بڑی دین ہے۔ اس قبیل کی نظموں میں "میں اور موت"، "بوڑھے سانپ کی موت"، "بیمار لڑکی" اور "ہسپتال" قابل ذکر ہیں "میں اور موت" میں اُس عہد کی تنہائی کا ذاتی تجربہ بیان ہوا ہے۔ اُس عہد کی گھٹن اور مارشل لا کی مکمل صورتِ حال بیان ہوئی ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر انیس ناگی کی رائے بہت وقیع ہے، کیوں کہ وہ خود اس کرب سے گزرے ہیں:

> "سلیم الرحمٰن کی نظم "میں اور موت" پہلے مارشل لا کی نفسیاتی اور جذباتی کیفیت کی ترجمان ہے۔ تنہائی، مایوسی، آدرش کے فقدان اور شہر میں رہتے ہوئے شہر سے لاتعلقی، ایک احساساتی اجنبیت کو پیش کرتی ہے۔ اس نظم میں شاعر اتھاہ مایوسی کے عالم میں خود ہی اپنی موت کا شاہد بن جاتا ہے۔"(۱۵)

نظم کا درج ذیل اقتباس دیکھیے:

خون میں لت پت لاش تھی میری اور سینے میں تیر
پتھر کی اونچی دیواریں، پانو میں تھی زنجیر
اُجلے کفن کی چادر پر تھے سُرخ گلاب کے پھول
لاکھوں لوگ اور روشنیاں اور قبرستان کی دھول(۱۶)

پوری نظم میں ایک اداسی، تنہائی اور ذات کا داخلی بحران موجزن موجود ہے، لیکن اس کے محرکات شہری زندگی کے خارجی پہلو ہیں اور انسان شہر سے جنگل کی جانب رواں دواں ہے، یہاں جنگل انسان کی گذشتہ زندگی کا وحشت ناک دور ہے، جب وہ خود جانوروں کی سی وضع کا حامل تھا۔ موجودہ انسان بھی اُسی جانب گامزن ہے اور تمدنی زندگی کو اپنی ہوس اور لالچ کے سبب موت کے گھاٹ اُتار رہا ہے۔ نظم کے آخری دو شعر سارا منظر نامہ واضح کر دیں گے۔

کبھی پیا ہے ہنس ہنس میں نے سارے دکھوں کا زہر
جنگل کی آواز کی کھوج میں چھوڑا ہنستا شہر
اک لمحے میں لاکھ انوکھے روپ لیے مرتا ہوں
وہ جو کہیں نہیں ہے اُس کی خواہش بھی کرتا ہوں(۱۷)

"شام کی دہلیز" میں مکمل طور پر یہی فضا چھائی ہوئی ہے۔ جہاں شہری انا کا سفر جاری و ساری ہے، لیکن شام کی دہلیز کے بعد کی نظمیں ایک نیا منظر نامہ ہے۔ سلیم الرحمٰن نے نئی تمثالوں اور علامتوں سے جدید عہد کے سیاسی و سماجی، معاشی و معاشرتی اور صارفی معیشت کے ساتھ ساتھ ثقافت کے نسیاں کو موضوع بنایا ہے۔ برطانیہ کے قیام کے دوران انھوں نے جہاں جدید تھیوریز کا مطالعہ کیا، وہیں انھوں نے مغربی تہذیب کا مشاہدہ بھی قریب سے کیا۔ انھوں نے مغرب کی تہذیب و ثقافت، صارفی معیشت، ورلڈ آرڈرز، بین الاقوامی منظر نامہ، میٹروپولیٹن شہروں میں پائی جانے والی بے گانگی اور مغربی معاشرے کی بے ثباتی اور احساسات و جذبات کی سرد مہری کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ سلیم الرحمٰن نے یہ باور کروایا کہ اُن کے ہاں احساسات و جذبات یخ بدن بادِ شمال میں مزید سرد ہو چکے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اجنبیت اور بے گانگی کا احساس شدت سے ہوتا ہے۔ برطانیہ کے قیام میں لکھی گئیں نظمیں اور غزلیں ایک ہی پس منظر رکھتی ہیں۔ ان دونوں مجموعوں کے عنوانات بھی ان کی فضا کو بیان کرتے ہیں۔ غزلیات کا مجموعہ بہ عنوان "مسافرت کا چاند" اور نظموں کا دوسرا مختصر مجموعہ "اجنبی سرد آسمان" ایک مہاجر کو پیش آنے والے واقعات کے ساتھ ساتھ مغربی معاشرت کی بھی مکمل تصویر پیش کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ارمان نجمی رقم طراز ہیں:

> "اجنبی سرد آسمان" کی تخلیقات بھی اسی مخصوص پیکر سازی، مصورانہ اُسلوب اور جمالیات توانائی کی فضا میں تجربے کی تجسیم کرتی ہیں، لیکن ایک بنیادی تبدیلی کے ساتھ جہاں انسانی تعلق خاطر (Human Concern) کے اساسی تاریخی شعور کے ساتھ منعکس ہوتی ہے۔ جہاں تخلیق کار کی سماجی و شعری حسیت ایک نئے مدار میں داخل ہوتی ہے اور جو سلیم الرحمٰن کے فن کی ایک نئی سمت کے فروغ کا سراغ بھی دیتی ہے، ان میں سے بیشتر نظمیں ترک وطن کے بعد برطانیہ کے قیام کے دوران کہی گئی ہیں۔"(۱۸)

"ہوا اجنبی ہے"، "تیسری دُنیا کا چہرہ" اور "اجنبی سرد آسمان" ایسی ہی نظمیں ہیں، جن میں مغربی باشندوں کی سرد مہری سے متعلق یورپ کا مکمل رویہ سامنے آتا ہے۔ ان نظموں میں مغربی باشندوں کی سرد مہری کا جہاں ادراک ہوتا ہے، وہیں تارکین وطن کی حالت زار اور روح پر لگنے والی

چوٹوں کا بھی پتہ ملتا ہے۔ اجنبی ہوا مکمل طور پر تیسری دُنیا سے بے رُخی و بے گانگی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ ہر طرف "تازہ سلوگن" تارکین وطن کو بے چین کرتے ہیں۔ وہ اپنے خوابوں کی کرچیاں ہوتے دیکھتے ہیں۔ یہ اقتباس دیکھیے:

اور دل ہے
راستوں کی آہٹیں سنتے ہوئے جواب بھی رُکتا ہے
اسی شدت
اُسی ویران بے چینی سے دُکھتا ہے
ہوا بے مہر ہے اور اجنبی ہے
اور میرے پانو تلے اس خاک میں
گزرے ہوئے خوابوں کی کرچیاں سی چرچراتی ہیں(۱۹)

"اجنبی سرد آسماں" بھی سلیم الرحمٰن کی ایک نمائندہ نظم ہے، جس میں ہجرت کا کرب موجزن ہے۔ اجنبی دیس میں نامیاتی معاشرہ کب کا ختم ہو چکا ہے۔ ہر شخص اتنا مصروف ہے کہ کسی کے پاس وقت ہی نہیں ہے۔ رشتے ناطے نام کو نہیں ہیں۔ گویا ہر شخص تنہا اپنے کرب میں مبتلا اور یخ بدن باد شمال میں ٹھٹھر رہا ہے۔ زمیں دوز ٹرینوں کے جال بچھے ہوئے ہیں، لیکن انسان اتنی آمد و رفت کے باوجود بھی ایک دوسرے سے مسلسل دور ہوتے جا رہے ہیں۔ سلیم الرحمٰن نے اس نظم میں زمیں کی وسعت کا تذکرہ بڑا معنی خیز کیا ہے۔ "زمیں پھیلتے پھیلتے آسمان کو نگلنے لگی ہے" انتہائی تہہ دار مصرع ہے۔ سائنسی دور کی موجودہ ترقی سے آسمان بھی انسانوں کی زد میں آچکا ہے۔ پھر آلودگی سے اوزون کی تہہ میں بھی سوراخ ہو رہے ہیں گویا آسمان کو درحقیقت زمین نگل رہی ہے۔ یہ ترکیب اُردو میں جس قدر نئی ہے اُسی قدر نادر و نایاب بھی ہے۔ نظم کا یہ اقتباس دیکھیے کہ کیسے ایک ایک شعر شانتی کا راگ الاپ رہا ہے:

زمیں پھیلتے پھیلتے آسماں کو نگلنے لگی ہے
بس۔ شانتی! شانتی!!
شانتی شانتی مانگنے والے شاعر کے اس شہر کا
شور میری رگیں چیرتا ہے
برف زاروں سے گزری ہوا
اب نسوں میں بھی چلنے لگی ہے(۲۰)

"تیسری دُنیا کا چہرہ" سلیم الرحمٰن کی نمائندہ ترین نظموں میں شمار ہوتی ہے۔ اس نظم میں تیسری دُنیا کے ایک باشندے کا مرقع کھینچا گیا ہے۔ جو اپنی تقدیر سنوارنے ایک ایسی سرزمیں کا رُخ کرتا ہے، جہاں تعصب اور نسل پرست لوگ رہتے ہیں۔ وہ اُسے کبھی قبول نہیں کریں گے اور اُس کی

شخصیت کو کچل کر رکھ دیں گے۔ تیسری دُنیا جہاں غربت اور مفلسی نے ڈیرہ ڈالا ہے، وہاں اُس کی زندگی کبھی خوش حال نہیں ہو پائے گی۔ اسی سوچ میں مبتلا وہ مغربی فضاؤں کے سرد تھپیڑوں کا رُخ کرتا ہے، لیکن اُس کے احساسِ محرومی میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر انیس ناگی رقم طراز ہیں:

> "تیسری دُنیا کا چہرہ" تیسری دُنیا کے احساس ہزیمت کی آئینہ دار ہے کہ آج بھی تیسری دُنیا اپنی بحالی اور مالی بہتری کے لیے پہلی دُنیا یعنی سفید فاموں کی دستِ نگر ہے۔ اسی محتاجی اور احساس ذات کو محو کر دیا ہے۔ سلیم الرحمٰن کی اس نظم میں ایک pathos بھی ہے، جو اُسے اورلی اور ہیتھرو کی ہوائی بندرگاہوں پر اُسے ایک تارک وطن کی بے بسی اور گھبراہٹ میں دکھائی دیتا ہے اور دوسری طرف اُسے غصہ بھی آتا ہے کہ تیسری دُنیا کے ساکن نے ایک مہربان فضا میں پناہ لینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اُسے یہ بھی یقین ہے کہ اُس کی دُنیائے نو کا خواب بھی ریزہ ریزہ ہو جائے گا، کیوں کہ اُس نے اپنی سرزمیں سے اپنا رشتہ کاٹ لیا ہے۔"(۲۱)

اس نظم میں مفلسی کا بوجھ، غم کا سوٹ کیس، دنیائے نو کا مانگا ہوا خواب، ہلتا ہوا ہاتھ، روتی آنکھ اور کتنے الوداع وغیرہم جیسی مثالیں ساری صورت حال کو واضح کر رہی ہیں۔ ایسی ہی تمثالیں تیسری دُنیا کا مکمل چہرہ عیاں کرتی ہیں، جو درحقیقت اُن کے مشاہدہ اور حقیقت نگاری پر دال ہے۔ اس نظم سے تیسری دُنیا کی اہمیت سفید فاموں کے ہاں کس قدر ہے اس کا ادارک ہوتا ہے۔ وہ مفلسی کا بوجھ، غم کا سُوٹ کیس اور دُنیائے نو کا خواب لیے مغربی فضاؤں میں چلا تو جاتا ہے، لیکن مغربی دُنیا اُس کی ذات کو اندر تک بکھیر کر رکھ دے گی۔

اب سفر کے موڑ پر ہے
بے مروت یخ بدن، باد شمال
نفرتوں کا زہر ہونٹوں پر لیے ریشہ ریشہ چیر دے گی
تیسری دُنیا کا چہرہ
بے ضمیری کی علامت اک بھکاری، اک سوال
رات دن تنہائیوں کے
"بولے وارڈ" اور "ایوے نیو" پر
پتی پتی اُس کے ہر خواب کو بکھرائے گا(۲۲)

نسل پرستی کا حامل مغربی معاشرہ تیسری دُنیا کے باشندوں سے بہت زیادہ تعصب رکھتے ہیں۔ سلیم الرحمٰن نے مغرب کے اس رویے پر کڑی تنقید کی ہے۔ مغرب میں نسل پرستی کے ساتھ ساتھ صنعتی معاشرے نے بھی انسان کی بے حرمتی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ امن کے نام پر جنگیں مسلط کرنا کوئی نئی بات نہیں ویت نام، عراق، افغانستان اور شام کی جنگیں امن کے نام پر ہی لڑی گئی تھیں۔ امن قائم کرنے کے پس پردہ اسلحہ ساز کمپنیوں نے انسانوں پر کیمیکل ہتھیاروں کے تجربات کیے، جس سے انسانیت کی نظریں شرمندگی سے جھک گئیں۔ ان تمام جنگوں میں لاکھوں لوگ اسی بارود کا

ایندھن بنے، جب کہ مغربی امن کے چیمپئین اپنی فتوحات کے ڈھول بجاتے رہے۔ ڈاکٹر سلیم الرحمٰن کے ہاں اس صورت حال کا گہرا شعور پایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سعادت سعید کی رائے بہت وقیع ہے:

> "سلیم الرحمٰن نے اپنی ابتدائی شاعری میں اپنی ذات اور سماج کے تناظر میں پاکستان میں موجود جس نیو کلونیکل ماحول کی عبرتوں کو موضوع بنایا تھا مغرب میں اپنے طویل قیام کے حوالے سے اُن کے بنیادی نتائج میں کوئی بڑی تبدیلی نظر نہیں آتی۔ البتہ نسل پرستی کی منطق اور پردیسی اجنبیت کے مفہوم سے اُن کی واقفیت اور زیادہ گہری ہو چکی ہے۔ بڑے صنعتی معاشروں میں موجود انسان کی بے حرمتی کا بغور مشاہدہ اُنھیں اپنے ماخذ سے گہرے طور پر وابستہ ہونے پر آمادہ کر چکا ہے۔ وہ امن کے نام پر جنگ کرنے والے، جمہوریت کے نام پر آمریت کو فروغ دینے والے سامراجی نظام کی ناانصافیوں کو نشانۂ تنقید بناتے ہیں۔" (۲۳)

"گیا سال" اور "ایک ملک کا جُغرافیہ" امن کے نام پر لڑی جانے والی جنگوں کا منظر نامہ ہیں۔ "ایک ملک کا جغرافیہ" اس سلسلے میں سب سے اہم نظم ہے۔ ورلڈ آرڈر نافذ کرنے والوں کے لیے کوئی ملک ایک نقشہ یا ایٹلس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا ہے۔ وہاں پر بسنے والے انسان کچھ وقعت نہیں رکھتے۔ معصوم بچے اور عورتیں سب ہلاک ہو جائیں، انھیں اس سے کچھ سروکار نہیں ہے۔ لوگ اس قدر جھک جاتے ہیں کہ اُن کے ہاتھوں اور قدموں کے نشان ایک ساتھ زمیں پر چھپ جاتے ہیں۔ یوں ہی وہ رینگتے، تڑپتے، سسکتے دم توڑ دیتے ہیں اور جو اپاہج ہوتے ہیں، اُن کا حساب الگ ہے۔ ان معصوم لوگوں کو قتل کرنے کے بعد امن کے نعرے فضاؤں میں گونجتے ہیں۔ امن کے نام پر جنگیں مسلط کر کے اسلحہ ساز ممالک در حقیقت اپنا ہی کاروبار چمکاتے ہیں، انھیں انسانیت سے چنداں غرض نہیں۔ ٹی وی پر جو خبر چلتی ہے، وہ ایک معلومات کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ صحافی بھی اس گھناؤنے کھیل میں شامل ہوتے ہیں۔ اس صارفی معیشت کے دور میں انسانیت کچھ نہیں ہے، بس خود غرضی اور ذاتی مفادات ہی سب کچھ ہیں۔ آگ اور بارود برستا ہے، تو صحافی فقط معلومات ہی پہنچاتے ہیں، نہ کہ انسانیت کا چرچا کرتے ہیں۔ گویا وہ اس قتل عام کا ادارک نہیں رکھتے اور نہ ہی اس کرب ناکی کا جس سے وہ لوگ گزر رہے ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر سلیم الرحمٰن کہتے ہیں کہ اُن کے نزدیک وہ خطہ محض ایک ملک کا جغرافیہ ہی ہے۔

ایک نقشہ
ایک ایٹلس کا صفحہ
گولیوں سے چھلنی چھلنی
خون میں لتھڑے ہوئے
ہاتھوں کے قدموں کے نشان
رینگتے، رُکتے ہوئے، دم توڑتے
آگ اور بارود برساتا ہوا

مرے ٹی وی پر فقط
خونخوار راتوں کا گرجتا آسماں!(۲۴)

اسی نوعیت کی نظم "گیا سال" ہے۔ جس میں شاعر نائن الیون کے سانحے کے بعد نئے سال کی آمد پر انسانیت کے قتل کا مرثیہ لکھتا ہے۔ اس نظم میں شاعر نے جو تمثالی اُسلوب قائم کیا ہے، اُس سے ایک کرب ناک نقشہ کھنچتا ہے۔ ٹوٹے ہوئے عضو، جھلسے ہوئے جسم، اخبار کے تراشوں میں لپٹی ہوئی زرد معصوم لاشیں ایسی ہی تمثالیں ہیں، جن سے اُس خون آشام حالات کا ادراک ہوتا ہے، جس سے ہزاروں لوگ لقمۂ اجل بنے۔ اس تناظر میں یہ مختصر سی نظم دیکھیے:

گیا سال
جاتے ہوئے
میری دہلیز پر
راکھ کا ڈھیر
جھلسے ہوئے جسم
ٹوٹے ہوئے عضو
ستمبر کی بربادیوں پہ لکھے مرثیوں
اور اخبار کی سرخیوں میں، تراشوں میں
لپٹی ہوئی زرد، معصوم لاشیں
ٹھٹھرتے ہوئے سرد سورج کی پہلی کرن میں بندھی
ورلڈ آرڈر کی مٹتی ہوئی دستاویزوں کے انباروں کو چھوڑ کر جا چکا ہے(۲۵)

ورلڈ آرڈر پر عمل درآمد کروانے کے لیے آئی۔ ایم۔ ایف (IMF) اور ورلڈ بنک (World Bank) کا سہارا لیا جاتا ہے، جو تیسری دُنیا کو اپنے شکنجے میں اس قدر جکڑ لیتے ہیں کہ ہمیشہ کی غلامی اُن کے مقدر میں لکھ دی جاتی ہے۔ غربت، افلاس، دہشت گردی، امن وامان کی خراب صورت حال اور جنگیں اُن پر مسلط کر دی جاتی ہیں۔ مغرب یوں ہی مشرق کو یرغمال بنا رہا ہے۔ جذبات واحساسات بوجھل ہو چکے ہیں انسانیت کا ڈھونگ رچا کر نادار اقوام کو تہہ تیغ کر رہے ہیں۔ محولہ بالا دونوں نظموں میں اس بات کا مکمل ادراک ہوتا ہے گویا انھوں نے اس قدر فن کارانہ چابک دستی سے گہرا مشاہدہ پیش کیا ہے کہ انسان انگشت بدنداں ہو جاتا ہے۔

بات کو سمیٹتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ سلیم الرحمٰن کی نظم ہر لحاظ سے جدید تر منظر نامے کی حامل ہے، جس میں نہ صرف عصری شعور کا مکمل ادراک ہوتا ہے، بل کہ انھوں نے جدید انسان کا ظاہر و باطن انتہائی ایمانداری اور بے باکی سے پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں ان کا تہذیبی و ثقافتی اور سیاسی و تاریخی شعور انتہائی وقیع اور حقیقت پسندانہ ہے، جو انھیں جدید شعرا کی صف میں نمایاں مقام عطا کرتا ہے۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ حامد کاشمیری، پروفیسر، جدید اُردو نظم اور یورپی اثرات، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۱۰ء، ص۴۹۵

۲۔ محمد ابرار احمد، ڈاکٹر سلیم الرحمٰن کی شاعری، مملوکہ: گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور، ص۶

۳۔ سلیم الرحمٰن، منظر جاگتا سوتا ہوا، ملٹی میڈیا افیئرز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص۲۷

۴۔ ایضاً، ص۲۷

۵۔ جیلانی کامران، نئے لکھنے والوں سے میری ملاقات، مشمولہ: نئی شاعری: ایک تنقیدی مطالعہ، مرتبہ: افتخار جالب، نئی مطبوعات، لاہور، ۱۹۶۶ء۔ ص۱۳۵

۶۔ ایضاً، ۲۸

۷۔ ایضاً، ۴۰

۸۔ عارفہ بتول، جدید اُردو نظم میں تصورِ انسان، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، مملوکہ: پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص۳۴۹

۹۔ منظر جاگتا سوتا ہوا، ص۴۲

۱۰۔ محمد حسن، پروفیسر، اصل سے بچھڑنے کا دُکھ، مشمولہ: منظر جاگتا سوتا ہوا "کلیات" سلیم الرحمٰن، ڈاکٹر، ص۱۶۳

۱۱۔ منظر جاگتا سوتا ہوا، ص۳۷

۱۲۔ ایضاً، ص۵۲

۱۳۔ ایضاً، ص۵۴

۱۴۔ ایضاً، ص۶۱

۱۵۔ انیس ناگی، ڈاکٹر، سلیم الرحمٰن کی نظمیں، مشمولہ: منظر جاگتا سوتا ہوا، کلیات: سلم الرحمٰن، ڈاکٹر، ص۱۷۰

۱۶۔ منظر جاگتا سوتا ہوا، ص۶۶

۱۷۔ ایضاً، ص۶۶

۱۸۔ ارمان نجمی، لامکانی سے نبرد آزما تغزل، مشمولہ: مسافرت کا چاند، مجموعہ: سلیم الرحمٰن، ڈاکٹر، کلاسیک، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص۱۳، ۱۲

۱۹۔ ایضاً، ص۱۱۱

۲۰۔ ایضاً، ۱۳۳

۲۱۔ انیس ناگی، ڈاکٹر، سلیم الرحمٰن کی نظمیں، مشمولہ: منظر جاگتا سوتا ہوا، ص۱۷۲

۲۲۔ منظر جاگتا سوتا ہوا، ص ۱۱۲

۲۳۔ سعادت سعید، ڈاکٹر، بصارتی بصیرتوں کا شاعر، مشمولہ: منظر جاگتا سوتا ہوا: ص ۸

۲۴۔ منظر جاگتا سوتا ہوا، ص ۱۲۹

۲۵۔ ایضاً، ص ۱۲۸